

مزید اشکالات

سلسلہ مروجہ نظام زمینداری اور اسلام

از قسم امت المحرم خان

جناب مولانا محمد طاسین صاحب کا مضمون توضیح اشکالات کے عنوان سے حکمت قرآن (۱۱۳) مارچ ۱۹۸۷ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے جو میرے ان چند سوالات کے جواب میں ہے جو ان کے مضمون میں مندرجہ ذیل سوالات اور اس کے جوابات میں نے کئے تھے، یہ سوالات حکمت قرآن کے ستمبر ۱۹۸۳ء کے شمارے میں شائع ہوئے تھے۔ چونکہ مولانا محمد طاسین صاحب کے جواب سے میرے ذہن میں مزید سوالات پیدا ہو گئے ہیں۔ لہذا مسئلہ کی مزید تحقیق کی خاطر یہ سطور لکھ رہا ہوں۔

میں جناب مولانا محمد طاسین صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے سوالات کا نہایت وضاحت سے جواب تحریر فرمایا۔ اس سے مجھے ان کا نقطہ نظر سمجھنے میں بہت آسانی ہوئی ہے۔

افراط زرا اور سود سے متعلق ہی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں، زر کا غذی یعنی نوٹ حقیقی طور پر اور بذات خود مال نہیں بلکہ تبادلہ مال کا ذریعہ تسلیم کر لینے کی وجہ سے مجازی طور پر مال ہیں۔ دنیا میں افراط زر کا اصل سبب کا غذی کرنسی کا رواج ہے اس کے ختم ہوتے ہی انسانیت کو افراط زر کی مصیبت سے بچنے کا راستہ مشکل ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب تک بارٹر سسٹم کے تحت اجناس کا تبادلہ اجناس سے ہوتا تھا یا جب تک رائج الوقت کے سونے چاندی کے ہوتے تھے، کبھی افراط زر کا مسئلہ اس طرح پیدا نہیں ہوا۔۔۔

دوسری طرف بعض ایسی مشینوں کی ایجاد نے کچھ لوگوں کے لئے سبیل کر لینی چاہئے کہ موقع فراہم کر دیا ہے جو کہ اصل کی ہو ہو کا پی کرتی ہیں حتیٰ کہ اصل و نقل میں کچھ امتیاز نہیں ہو سکتا، پھر اس میں کچھ اضافہ ان شرکاتی کمپنیوں اور بینکوں کے ذریعے بھی ہوا جو اپنی مالی حیثیت سے زیادہ کا غذی شیراز اور سندات جاری کرتے ہیں۔ (صفحہ ۶)

اولیٰ یہ بات کہ زر کا غذی حقیقی مال نہیں ہے ایک پرانی راستہ ہے جو اس زمانے میں قائم کی گئی تھی جب زر کا غذی کا آغاز ہوا تھا۔ اب آہستہ آہستہ زر کا غذی تمام کاموں میں استعمال ہوتا ہے اور ساری دنیا میں اس کا کہیں بھی تبادلہ سونا یا چاندی سے نہیں ہو سکتا۔ لہذا عملاً زر کا غذی اسی طرح

سے مال ہے جس طرح کہ کوئی دوسرا مال یہی وجہ ہے کہ زر کا غذی پر زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے، اگر یہ مال حقیقی معنوں میں منیں تو پھر اس پر زکوٰۃ بھی عائد نہیں ہونا چاہیے۔ حالانکہ یہ رائے کسی کی بھی نہیں ہے۔

دوم، یہ رائے کہ افراط زر کا علاج زر کا غذی سے دوبارہ دھاتوں کے ذریعہ بائزر سسٹم کی طرف پلٹنا ہے عملی نظر ہے۔ اس کی حمایت میں پوری دنیا میں ایک رائے بھی منیں ہے نہ کسی تجزیے کے ذریعے سے اسے ثابت کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی پوری دنیا میں اس پر کوئی عمل کرنا تیار ہوگا، ایسا علاج خواہ اسلام کے نام پر پیش کیا جائے یا منطق کے زور پر، کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ سوم، جعلی کرنسی افراط زر کا ذریعہ ہے، ایک نئی بات ہے، پوری دنیا میں کس قدر جعلی کرنسی گردش میں ہے، کسی کو معلوم نہیں ہے، لہذا اس طرح کی بات ثابت نہیں کی جاسکتی۔

چوتھا، اگرچہ کہ ایک کٹنگی شیعہ زور سندت "سے مولانا کی کیا مراد ہے" مضمون سے واضح نہیں ہوتا۔ افراط زر میں یہ کس طرح ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں، یہ بھی نہیں چلتا۔ آگے چل کر مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"لہذا اسلام کی رو سے ان (کرنسی نوٹ) کے قرضہ میں اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ بوقت قرضہ ان نوٹوں سے کوئی حقیقی مال کتنی مقدار میں مل سکتا تھا، حقیقی مقدار میں وہ مال مل سکتا تھا، نوٹوں کی تعداد کی بجائے اس کو قرضہ منظور کیا جائے اور پھر ادائیگی اس کے مطابق ہو۔ مثلاً زید نے بکر کو سو روپے کے کرنسی نوٹ ایک سال کے لئے بطور قرض دیتے جب کہ دیتے وقت ان کے عوض بازار میں ایک من غلہ مل سکتا تھا تو اس صورت میں نوٹوں کی بجائے ایک من غلہ کو قرض تصور کیا جائے گا یا بکر نے زید سے ایک من غلہ ایک سال کے لئے قرض لیا۔ لہذا ایک سال کے بعد بکر پر لازم ہوگا کہ وہ زید کو اتنی رقم ادا کرے جتنی اس وقت ایک من گندم یا چاول کے برابر ہو۔ (ص ۷۸)"

اس سلسلے میں درج ذیل باتیں قابل غور ہیں۔ اول، یہ بات متنازع فیہ شکل اختیار کر سکتی ہے کہ کسی وقت حقیقی مال کیا ہو، بیسیوں اشتیاء میں سے کس چیز کو آپ معیار کے طور پر اختیار کریں گے۔ اور جس چیز کو اختیار کریں گے اس کی شریعت سے کون سی سند لائیں گے؟

دوم، اس وقت دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی اپنی قدر و قیمت یکساں رہتی ہو، حتیٰ کہ سونا بھی روز بڑھتا رہتا ہے۔ پھر ایسی چیز جو خود یکساں قدر و قیمت کی مالک نہ ہو، مذکورہ بالا صورت میں قدر و قیمت کا معیار کیسے قرار دی جاسکتی ہے؟

سوم، اور یہ سب سے اہم بات ہے کہ جناب مولانا صاحب نے اپنے مذکورہ حل میں یہ طے

کر دیا ہے کہ روپے کے بدلے روپے کے ادھار تباد لے کی صورت میں قدر و قیمت (QUALITY) کا اعتبار کیا جائے گا۔ یعنی اگر قدر و قیمت میں فرق آجائے تو تبادلہ برابر سہا بن نہ ہوگا بلکہ اصل قدر و قیمت کے مطابق ملے پائے گا، حالانکہ یہی وہ بات ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً بالافضل کہہ کر حرام قرار دیا ہے۔ وہ مشہور حدیث جس میں ایک صحابیؓ تین صاع گھٹیا کھجوروں کے بدلے میں دو صاع عمدہ کھجوریں لے آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ربا الفضل قرار دیا، اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اشیاء کے تبادلے میں اگر وہ ایک ہی جنس کی ہوں قدر و قیمت (QUALITY) کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ کمیت (QUANTITY) کا اعتبار ہوگا۔ جناب مولانا محمد طاسین صاحب کے مذکورہ بالا اصل میں روپے کے تبادلے میں اصل اعتبار قدر و قیمت (QUALITY) کا ہے جو اس کو صراحتاً ربا الفضل کا معاملہ بنا دیتا ہے۔

مزارعت میں زمین کی پیداواری صلاحیتوں کے معاوضے کا سوال ہے۔ اس پر

دوسرا سوال

موصوف تحریر فرماتے ہیں: "یہ زمین میں جو پیداواری صلاحیت ہوتی ہے، وہ قدرتی اسباب و عوامل کے زیر اثر وجود میں آتی ہے اور ایک خالص قدرتی چیز ہوتی ہے اور وہ اس شخص کے لئے قدرت کا مفت عطیہ ہوتی ہے جو زمین کو کاشت کرتا ہے" (صفحہ ۶۱)

یہ ایک دلچسپ انداز بحث ہے، اگر زمین کی پیداواری صلاحیتیں قدرت کا عطیہ ہیں تو انسانی پیداواری صلاحیتوں کے بارے میں مولانا کی کیا رائے ہے؟ کیا انسان ان کا مالک و خالق ہے؟ جس منطق کی رو سے مؤخر الذکر کا معاوضہ جائز ہے اس کی رو سے اول الذکر کا ہونا چاہیے۔ مولانا کے پاس ان میں فرق کرنے کے کون سے عقلی دلائل ہیں؟

صرف محنت کے عامل پیدائش ہونے کے بارے میں ہے، یہ بحث معاشیات

تیسرا سوال

کی کتابوں میں بہت تفصیل سے موجود ہے کہ سرمایہ عامل پیدائش ہے یا نہیں، سرمایہ دارانہ حیثیت اور اشتراکی معیشت کے علمبرداروں نے اپنی اپنی طرف سے بہت دلائل دیتے ہیں اور معاملہ کسی طرح سے بھی فیصلہ کن شکل اختیار نہیں کر سکا۔ البتہ ہم اس فریم ورک میں رہتے ہوئے جو خود جناب محمد طاسین صاحب نے اپنے لئے مہیا کیا ہے درج ذیل محرومات پیش کرتے ہیں:

اول، مولانا بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سرمایہ اصل میں ماضی کی محنت ہی ہے (صلحاً) جو کہ سرمایہ کی شکل میں جمع ہو گئی ہے۔ اس صورت میں سرمائے کا معاوضہ نہ ہونا عقل کے خلاف ہے۔ کیونکہ سرمایہ کچھ نہیں ہے سوائے جمع شدہ محنت کے اور محنت کے معاوضہ کے مولانا خود قائل ہیں، لہذا سرمائے کے معاوضے کی مخالفت سمجھ میں نہیں آتی۔

دوم، مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ و محنت کی تمام کش مکش اس وجہ سے

ہے کہ فریقین کا حصہ کرنے کا کوئی دائمی اور عادلانہ فارمولہ نظام میں نہیں ہے۔ اب اسلامی نظام کو لیجئے، فرض کیجئے ایک شخص اپنے سرمائے اور محنت سے کاروبار کر رہا ہے، وہ اپنے ساتھ کسی دوسرے شخص کو شریک کر لیتا ہے جو صرف محنت کر سکتا ہے اور اس کے پاس سرمایہ نہیں ہے فرض کیجئے دونوں ایک ہی صلاحیت کے انسان ہیں اور یکساں اوقات کام کرتے ہیں، اسلامی نظام میں ان کے درمیان منافع کی تقسیم کیسے ہوگی؟ ایک صورت یہ ہے کہ دوسرا شخص ملازم ہو۔ اس صورت میں بھی چونکہ پہلا شخص اور دوسرا شخص برابر کی محنت کر رہے ہیں، مولانا کے انصاف کی روش سے دونوں کو برابر برابر حصہ ملنا چاہیئے (چونکہ سرمایہ تو عامل پیدا نہیں ہے) اور زیادہ سے زیادہ پہلا شخص سرمائے کی فراہمی کے مزید لے سکتا ہے، کیا مولانا کے نزدیک یہی صورت تقسیم منافع کی ہوگی یا کوئی دوسری؟ اور اگر یہی ہوگی تو کسی بھی غیر جانب دار معقول آدمی سے پوچھ لیں کہ کیا یہ انصاف ہے؟

اساتو جارا ایڈ کا ہے عقل سلیم بھی اسے تسلیم نہیں کرے گی، علاوہ انہیں خود معاشی قوتیں اتنی مضبوط اور طاقتور ہیں کہ وہ اس طرح کے انصاف کو ہوا میں تحلیل کر دیں گی۔ کوئی شخص بھی اپنے سرمائے اور محنت کے ساتھ صرف محنت کرنے والے کو برابر کا شریک نہیں ٹھہرائے گا، تب محنت کرنے والے کہاں کام کریں گے؟ سرمایہ کہاں سے فراہم ہوگا؟ خود مولانا تسلیم کرتے ہیں کہ اس نظریہ کے سب سے بڑے علمبردار اشتراکی ممالک بھی اس پر عمل نہ کر سکے، یہی نہیں، اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں سے کسی دور، کسی ملک، اپنول خلفائے راشدین میں دکھا دیجئے کہ کہاں یہ بات رائج رہی ہے کہ معاوضہ کا حق صرف محنت کو رہا ہو؟ یہ ایک ایسا خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں ہے، اگر علامہ ابن خلدون یا کسی دوسرے مفکر نے ماضی میں بھی یہ رائے رکھی ہے تو اس سے چنداں فرق نہیں پڑتا عمل کب اس پر ہوا ہے؟ اس کے کیا امکانات ہیں کہ اس پر آئندہ بھی عمل ہو سکے۔

صرف محنت کو معاوضہ کا حق دار مان کر ہم بہت سی اور پیچیدہ کیوں کا دروازہ بھی کھولتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں حکومتوں اور کاروباروں کے لئے سرمائے کا ایک بڑا حصہ گھروں بچتوں (House hold savings) کی شکل میں میسر آتا ہے۔ اگر ان بچتوں کو مفید طور پر استعمال کرنے کا محرک نہیں لیا جائے تو کون اپنا سرمایہ کاروباروں اور حکومتوں کو دے گا؟ شریعت کی کوئی ایسی تعبیر جس سے آپ انسانیت کو مفید کاموں سے محروم کر دیں کسی دور میں بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ ان بچتوں پر شریعت نے سود کو حرام قرار دیا ہے، لیکن اس سے بڑھ کر اسے مضاربت و شرکت کی بنیادوں پر لگانے پر بھی پابندی لگا دی جلتے تو اس سے خواہ مخواہ شریعت کا قافیہ تنگ ہو جائے گا۔ یہ فقہی بحث کہ شرکت کے لئے محنت لازم اور مضاربت ایک مشتبہ شکل ہے، اس عظیم منفعوت کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے جو انسانیت کو اس سرمائے کے استعمال سے بچ سکتی ہے۔

یہی نہیں، اگر آپ لوگوں کو مضاربت پر سرمایہ لگانے سے روکتے ہیں، کیونکہ آپ کے نزدیک یہ فی الاصل مباح نہیں بلکہ مشتبہ ہے، تو آپ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو جو حلال ذرائع سے روپیہ کماتا کر کچھ بچا لیتی ہے اور پھر مضاربت کے ذریعہ اس میں اضافہ کر لیتی ہے اس آسانی سے محروم کرتے ہیں۔ اس طرح سے بیوہ عورتیں اور یتیم بچے جو خود کمائی نہیں سکتے، شریعت کی اس اجازت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی مثالی معاشرے میں بیواؤں اور یتیموں کی نگہداشت حکومت کرتی ہے لہذا انھیں مضاربت کی ضرورت نہیں تو یہ ایک کم تر درجے کا اہتمام ہے۔ کیونکہ آپ لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے سے روک کر حکومت کی مشینری کا محتاج رکھنے کا حل بتا رہے ہیں۔ اور ساری دنیا گواہ ہے کہ یہ ایک غیر مستند (INEFFICIENT) حل ہے۔

اس کے علاوہ اگر شریعت نے وراثت میں عورتوں کا حصہ رکھا ہے، اگر عقیق نظر سے دیکھا جائے تو دو عورتوں کے برابر ایک مرد کے حصہ کی رو سے کسی معیشت کی تمام دولت کے ایک تہائی حصہ کی مالک عورتیں قرار پاتی ہیں۔ شریعت کی مقصدی تعبیر کی رو سے عورتوں کا جو معاشرتی رول ہے وہ انھیں اجازت نہیں دیتا کہ وہ مردوں کے شانہ بشانہ کاروبار کریں اور محنت کر کے کمائیں۔ اس طرح سے وہ ایک تنہائی دولت جس کی عورتیں قانوناً مالک ہیں یا تو بے کار رہے یا پھر مضاربت کے ذریعے سے کاروبار میں لگے۔ مضاربت کے خلاف جو بھی فقہی اعتراضات ہوں ان پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ مضاربت کو مشتبہ یا مکروہ قرار دے کر ہم شریعت سے ایک ایسی وسعت کو واپس لے رہے ہیں جو کہ اس دور کے ان گنت مسائل کا حل کر سکتی ہے۔

اس کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عربوں کے تجارتی قافلے جاتے تھے جن میں مکے کی عورتیں اور بوڑھے مرد پیسہ لگاتے تھے۔ یہ قافلے مضاربت کی بنیاد پر سرمایہ جمع کرتے تھے اور کاروبار کرتے تھے۔ ویسے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مضاربت رائج تھی، تاریخی طور پر اس کا ثبوت موجود ہے (بعد کے ادوار میں بھی یہ موجود رہی ہے اس پر مستشرقین نے بیش قیمت تاریخی شواہد جمع کئے ہیں) لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس سے نہیں روکا۔ اور یہ اصول مستحکم ہے کہ اگر کسی رائج الوقت عرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں فرمایا تو وہ عرف جائز ہے۔

اس دور میں جب کہ سود ہماری زندگی میں خون کی طرح پیوست ہے اور معاشی پیچیدگیاں اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہیں، ایسے اجتماعات کی ضرورت ہے جو لوگوں کو حلال کے اندر رہتے ہوئے آسانی فراہم کریں کہ ایسا قافیہ تنگ کیا جائے کہ لوگ چاہیں بھی تو شریعت پر عمل نہ کر سکیں۔ جن چیزوں کو شریعت نے حرام نہیں کیا ہم انھیں خود سے حرام کر کے لوگوں کی دشواریوں میں اضافہ کئے جا رہے ہیں۔